تماشا کرو انھیں

(محمود احمد برکاتی مرحوم)

''اگر کسی کو مشرقی تہذیب و شائستگی کو مجسم دیکھنا ہو تو وہ محمود میاں کو دیکھ لے۔'' یہ ایسا جملہ نہیں کہ رسماً کہہ دیا گیا ہو۔ یہ حقیقت ہے اور مشرقیت کے نمونے سے مراد محض لباس کی تراش خراش اور جسمانی ہیئت نہیں بلکہ اس میں مشرقی ایمان و ایقان، اقدار و حکمت، انداز نظر اور طرزِ زندگی سبھی کچھ شامل ہے۔ محمود میاں مشرقیت کا مکمل، زندہ اور طرح دار نمونہ ہیں جنھیں دیکھ کر اپنی مشرقیت سے پیار کرنے کو جی چاہتا ہے اور مشرقیت کے معاملے میں معذرت خواہی کے بجائے فخر و افتخار کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔

کچھ لوگ محض اس لیے بڑے ہوتے ہیں کہ ان کی نسبتیں بڑی ہوتی ہیں ورنہ خود ان میں بڑائی کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ محمود میاں خود بھی بڑے ہیں اور ان کی نسبتیں بھی بڑی ہیں۔ وہ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جس میں اعلیٰ انسانی اقدار اور ان اقدار سے وابستگی کی طویل روایت چلی آتی ہے۔ ان کے بزرگ تحریک مجاہدین میں سرگرم اور سرکردہ رہے۔ ان کے دادا مولانا حکیم سیّد برکات احمد صاحب اپنے عہد کے بہت بڑے عالم، مفکر، ماہر تعلیم، طبیب اور سب سے بڑھ کر متقی اور خدا ترس بزرگ تھے۔ ان کے پردادا نے ٹونک میں اپنے گھر کے سامنے

ایک وسیع مسجد اور مسافر خانہ تعمیر کرایا۔ دادا نے ایک مدرسہ قائم کیا جس میں اقامت کا بندوبست بھی تھا اور جس میں دنیا بھر کے مسلم ممالک سے تشنگانِ علم آتے اور سیراب ہو کر جاتے۔ مہمانوں کی میز بانی اس طرح کی جاتی جیسے کسی خانقاہ میں لنگر جاری ہوتا ہے۔ علم و عمل، خیر و برکت اور جود وسخا کے اس ماحول میں حکیم سیّد محمود احمد برکاتی نے آنکھیں کھولیں، پرورش پائی اور ان کی شخصیت تعمیر و تشکیل میں ان اقدار نے بڑا اہم حصہ لیا۔ محمود میاں اپنے کاندھوں پر خاندانی روایات کا بڑا بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں مگر اس بوجھ نے انھیں ہلکان نہیں کیا۔ اس بوجھ کو وہ اسی طرح اٹھائے ہوئے ہیں جیسے کوئی شخص اپنا پسندیدہ کام کرتا ہے۔

محمود میاں عرصہ دراز سے جماعت اسلامی سے وابستہ ہیں۔ یہ وابستگی محض ایک جماعت کی رکنیت نہیں بلکہ یہ اسلام سے ان کی غیر متزلزل وابستگی، اس پر اصرار اور اس کے اظہار کی غماز ہے۔ اسلام سے وابستگی تو کسی جماعت سے تعلق کے بغیر بہ خوبی برقرار رکھی جا سکتی ہے اور رہتی ہے مگر اس وابستگی پر اصرار اور اس کا اظہار کسی پلیٹ فارم کا محتاج ہوتا ہے، ان کے بزرگوں نے اس کے لیے جماعت مجاہدین کا دامن تھاما تھا، محمود میاں نے جماعت اسلامی کا سایہ اختیار کر لیا ورخاندانی روایت کی اس تشکیل کو برقرار رکھے ہوئے ہیں جو خانوادوں کی زندگی اور بقا کا ضامن ہوا کرتا ہے۔ اس روایت کو دوسری روایات کی طرح وہ اپنی اولاد میں بھی منتقل کرنا چاہتے ہیں اور نسلی بُعد کے اس دور میں وہ اپنی اس کوشش میں کام یاب بھی ہوئے ہیں اور اپنے خاندان کو زندہ اور جان دار خاندان بنائے ہوئے ہیں۔ افراد اور اقوام کی طرح خاندانوں کی عمریں بھی ہوا کرتی ہیں۔ جب کسی خانوادے کی اعلیٰ روایات مرجاتی ہیں تو اس خاندان کے افراد کے پاس داستانِ پاستان کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا اور رفتہ رفتہ وہ اپنی موت آپ مرجاتے ہیں۔ بہت سے راسخ خاندانوں کا پاکستان میں جو حشر ہوا ہے وہ اس کی بین دلیل ہے۔ محمود میاں اس حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے کہ نقلِ مکانی اور 1947ء کے ہلا ڈالنے والے انقلاب کے بعد بھی وہ اپنے خانوادے میں ان اقدار و روایات کی پاسبانی کرتے رہے جو انسانیت کی اعلیٰ اقدار ہیں اور جن

کے وجود کے باعث ہی کوئی خاندان شریف کہلایا جاسکتا ہے۔

میں نے ابھی کہا کہ محمود میاں کے لیے جماعت سے وابستگی کسی سیاسی جماعت کی رکنیت اختیار کرنے کے ہم معنی نہیں بلکہ ان کی اپنی زندگی کو معنویت و مقصدیت عطا کرنے کا معاملہ ہے، اس لیے اس وابستگی کو وہ معمولی نہیں سمجھتے۔ایک بیدار معزز انسان کی حیثیت سے انھیں جماعت، اس کے طریقۂ کار اور پالیسیوں سے اختلافات ہوسکتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ہیں مگر وہ کسی زبان دراز شخص کے وظیفہ لب کو اس سلسلے میں ہرگز برداشت نہیں کرتے۔ ہمارے سکّہ بند دانش ور عام طور پر اپنے آپ کو مذہب بیزار یا کم از کم مذہب کے معاملے میں ''انتہائی روادار'' ظاہر کرتے ہیں اور یہی فی زمانہ دانش وری کا لباس ظاہری ہے، اس لیے مذہبیت اور مذہبی طرز فکر سے انھیں اللہ واسطے کا بیر رہتا ہے۔ چناں چہ ہر اس آواز کو دبانے اور ہر اُس نقش کو مٹانے میں اپنا زور صرف کرتے ہیں جو مذہب کے زیرِ اثر ہو۔محمود میاں ایسے بے بصر دانش وروں کے ازلی دشمن ہیں اس لیے جب کسی ایسے حلقہ سے جماعت پر پیشہ ورانہ حملہ ہوتا ہے تو محمود میاں کی نرم گرفتاری، انفعالیت اور شرافت یکا یک دلیری، تیکھے پن اور جارحیت میں بدل جاتی ہیں۔ وہ اپنے نرم اور پُرسکون لہجے میں ایسے تند و تیز حملے کرتے ہیں کہ مخالف کو پسپائی اختیار کرتے بنتی ہے۔اس معاملے میں نہ وہ دوستی کا خیال کرتے ہیں، نہ مصلحت کے تقاضوں پر توجہ دیتے ہیں۔نظریاتی امور میں رواداری کے وہ قائل نہیں۔

البتہ مذہبی امور میں ان کی رواداری روایتی ہے۔ وہ ایک ایسے خاندان کے فرد ہیں جس میں حنفی مسلک صدیوں سے مقبول ہے۔مولانا فضل حق خیرآبادی سے ان کی نسبت نے اس مسلک کے معاملے میں ان کی استقامت کو مزید تقویت دی ہے لیکن اگر کبھی کوئی کم فہم شخص بھرے میں آکر ان کے سامنے اہل حدیثوں، وہابیوں یا حنبلیوں کو بُرا بھلا کہنے لگے تو محمود میاں ان کے دفاع پر اُتر آتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ پشتینی وہابی ہیں۔اس میں دخل کچھ وہابیوں کی صحبت کا نہیں، یہ محمود میاں کی ذاتی فکر کا حصہ ہے کہ امت کا ہر فقہی مکتب حق ہے البتہ حق کا فیصلہ ہر انسان کا

ذاتی فیصلہ ہے لیکن حق کی تکذیب یا اس پر ملامت کسی طور درست نہیں ۔ وہ فقہی اختلافات کو مسلمانوں کے تنزل اور ان کے بگاڑ کا سبب سمجھتے ہیں اور اس لیے کسی ایک مکتبۂ فکر کی طرف سے دوسرے پر متعصبانہ حملے ان کے لیے نا قابل برداشت ہوتے ہیں ۔ اس معاملے میں ان کی غیر معمولی رواداری ہر مسلمان کے لیے نمونۂ تقلید ہے ۔ وہ ایسے موقع پر

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

کی مجسم تصویر بن جاتے ہیں اور سکّہ بند ٹکسالی دانش وروں کے مقابلے میں

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

کی تفسیر نظر آتے ہیں ۔ ان کے کردار کی یہ کیفیت اتنی نمایاں ہے کہ ان کی ذات سے تعلق رکھنے والا ہر شخص اس سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے ۔

محمود میاں اپنی شکل و شباہت اور لباس و مزاج کے اعتبار سے تو مشرقی ہی ہیں، رہن سہن اور اکل و شرب کے معاملے میں بھی وہ مغرب کو ناپسند کرتے ہیں ۔ ''بنگلہ'' کے مقابلے میں مکان میں رہنا انھیں پسند ہے صحن ان کی مشرقیت کو سازگار آتا ہے ۔ فلیٹ میں رہائش کا شاید انھوں نے تصور بھی نہ کیا ہو ۔ شادی کی ایک دعوت میں میٹھے کے طور پر ایسا کسٹرڈ فراہم کیا گیا تھا جس میں کیک شامل ہوتا ہے ۔ نہ جانے ایسے کسٹرڈ کو کیا کہتے ہیں ۔ بہرحال میٹھا تھا اور اپنے ذوق کے مطابق مجھے اسے ضرور کھانا تھا ۔ میں نے محمود میاں سے عرض کیا ۔ '' آپ کے لیے لاؤں'' فرمانے لگے ''یہ انگریزی میٹھے مجھے مطلق پسند نہیں ۔ اپنی فیرنی یا کھیر میں کیا نفاست ہوتی ہے ۔''

یہ معاملہ محض کسٹرڈ اور کھیر کا نہیں، یہ ان کا مستقل رویہ ہے ۔ وہ محض فیشن کے طور پر مشرقی اشیا کا ترک گوارا نہیں کر سکتے، نہ محض مغربی ہونے کی وجہ سے کسی چیز کو اختیار کر سکتے ہیں ۔ وہ تو اپنے ذوق و مذاق اور ضروریات و کفالت کے امور کو مدِ نظر رکھتے ہیں ۔

محمود میاں پیشہ کے لحاظ سے طبیب ہیں ۔ وہ طبِ یونانی کو کوئی اعتبار سے ایلوپیتھی سے بہتر سمجھتے ہیں اور اس کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ طب یونانی میں تحقیق و جست جُو کے خاتمے کے

باعث ترقی نہ ہو سکی اس لیے وہ تشخیص کے سلسلے میں تمام جدید طریقہ ہائے کار سے مدد لیتے ہیں۔ وہ محض قارورہ دیکھنے پر اکتفا نہیں کرتے پیشاب کی لیبوریٹری رپورٹ دیکھتے ہیں، بلڈ پریشر لیتے ہیں خون کی رپورٹ ملاحظہ کرتے ہیں مگر علاج کرتے وقت طریقہ علاج میں شرک نہیں کرتے وہ علاج خالصتاً یونانی ادویہ سے کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یونانی ادویہ کے ساتھ ایلو پیتھک دواؤں کا استعمال محض مغرب سے مرعوبیت ہے۔ پھر چوں کہ ہم ان ادویہ کے طبی خواص سے کما حقہ واقف نہیں نہ ان کے غیر معمولی ردِ عمل سے آشنا ہیں اس لیے ہمیں اپنا ہی طریقۂ علاج اختیار کرنا چاہیے۔ وہ صرف یونانی دواؤں سے علاج کرتے ہیں البتہ حیاتین کو مستثنا سمجھتے ہیں اور اگر ضروری خیال کرتے ہیں تو اپنے مریضوں کو حیاتین کے استعمال کی اجازت دیتے ہیں۔

محمود میاں کا تعلق اپنے مریضوں سے رسمی نہیں ہوتا۔ وہ بڑی دل سوزی سے علاج کرتے ہیں۔ رات کی تنہائی میں مریض کے مرض کے بارے میں بار بار غور کرتے ہیں۔ دوسری ملاقات میں بعض مزید استفسارات کرتے ہیں، نسخے میں ردوبدل کرتے ہیں مگر جب ایک نسخہ پر شرح صدر ہو جاتا ہے تو پھر اسے پسند نہیں کرتے کہ مریض اکتا کر علاج سے گریزاں ہو۔ ایسے مریضوں پر وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔

انھیں یہ بھی گوارا نہیں کہ طبیب کو کسی طور پر ڈاکٹر سے کم تر سمجھا جائے۔ اس معاملے میں ان کے احساسات بڑے نازک ہیں۔ وہ شدید بیماری میں بھی ٹھیک مقررہ وقت پر مطب پہنچ جاتے ہیں۔ انھیں خیال رہتا ہے کہ ان کے نہ جانے سے کتنے مریضوں کو زحمت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ چناں چہ اکثر 102 ڈگری بخار میں مطلب میں بروقت پہنچتے ہیں۔ حال ہی میں ہرنیا کا آپریشن کرایا۔ ڈاکٹر نے آرام کا مشورہ دیا تھا۔ موصوف دو چار روز بعد ہی مطب میں جا بیٹھے۔ لطف یہ کہ پورے وقت مطلب میں بیٹھیں گے۔ البتہ پابندی وقت کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔ ٹھیک ایک بجے مطب بند ہو جاتا ہے اب باہر سے کوئی شخص اندر نہیں آ سکتا۔

ایک بار ٹھیک ایک بجے مطب بند کیا۔ میں اندر موجود تھا سوا بجے کے قریب باہر سے

کسی صاحب نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دوا لینے آئے تھے۔ محمود میاں نے فرمایا چار بجے دوبارہ مطب کھلے گا اس وقت آجانا۔ کہنے لگے، لانڈھی سے آیا ہوں۔ فرمایا ''بروقت کیوں نہ پہنچے۔ اب چار بجے تک انتظار کرو۔'' اس نے کہا ''مریض کی حالت درست نہیں۔''

فرمانے لگے ''لکھ کر دے دوں کہ چار بجے تک نہیں مرے گا۔''

مجھے ان کے اس طرزِ کلام پر حیرت ہوئی۔ وہ بڑے بامروت آدمی ہیں مگر پابندی وقت کے علاوہ ایک اور چیز بھی تھی جس نے اس طرز گفتگو پر انھیں مجبور کیا۔ اس کے جانے کے بعد کہنے لگے یہ لوگ اطبا کو خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ یہی علاج ڈاکٹر سے کرار ہے ہوتے تو صبح نو بجے سے لائن میں لگے ہوتے۔ حکیم صاحب کے ہاں جب چاہیں چلیں آئیں۔ ان کی تربیت ضروری تھی۔ محمود میاں کی یہ بات حرف بہ حرف صحیح تھی، مجھے اطمینان ہوگیا۔

بڑوں کی عزت سب ہی کرتے ہیں مگر چھوٹوں کا اکرام کرتے جس طرح محمود میاں کو دیکھا ایسا کم ہی دیکھنے میں آیا۔ اپنے چھوٹوں کو کھڑے ہو کر خوش آمدید کہتے ہیں۔ میاں کے لاحقہ کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ میرے آتے یا جاتے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گھڑوں پانی پھر جاتا ہے مگر وہ بھلا کب کسی کی مانیں ہیں۔ ان کا یہی چلن ہے۔ ہم ٹونک والے چھوٹے بچوں کو ننھا یا ننھی کہا کرتے تھے۔ اب یہ چلن بھی ختم ہوگیا۔ صرف محمود میاں کے دم سے زندہ ہے۔ میری لڑکی اور اہلیہ ان کے زیرِ علاج تھیں، کبھی نام لے کر ان کا حال دریافت نہیں کیا۔ ہمیشہ یہی پوچھا ننھی کیسی ہے؟ دلہن کا کیا حال ہے؟ ان کے مطب سے دوا لے کر بھی شرمندگی ہوتی ہے۔ آج کل کے مریضوں کو تو شاید ان کی دوا سے شفا ہی نہ ہو کیوں کہ دوا کی قیمت اتنی کم ہوتی ہے کہ نو دولتیوں کو راس ہی نہیں آتی۔ یہ تو عام مریضوں کے لیے ہے۔ ہم جیسے نیاز مندوں کو دُہری مصیبت ہے۔ کوشش کر کے دوا ساز کے پاس جانا پڑتا ہے اور دوا اس طرح لیتے ہیں گویا چوری کر رہے ہوں، ورنہ ان کا بس چلے تو وہ ساری عمر علاج کرتے رہیں اور دوا کی قیمت بھی نہ لیں۔

علما کا احترام بڑے اہتمام سے کرتے ہیں۔ بیش تر لوگ ان کے ہم عصر ہیں، ہم پلہ

ہیں مگر وہ ہیں کہ ان کے آگے جھکے جاتے ہیں۔ بس رکوع میں تھوڑی کسر رہ جاتی ہے۔ پان کھڑے ہو کر پیش کریں گے۔ کوئی کتاب دیں گے تو کھڑے ہو کر دیں گے۔ مولانا منتخب الحق مرحوم سے بڑی خصوصیت تھی۔ وہ ان کے گھرانے کے شاگرد مگر خود محمود میاں کے استاد تھے۔ وہ تشریف لاتے تو یہ کھڑے ہو کر پان پیش کرتے، اگال دان خود اٹھا کر لاتے، اپنی تصانیف خدمت میں گزارتے۔ اس سے خود ان کی تشفی ہو جاتی اور اولاد کی تربیت بھی۔

علمی مذاق انھیں ورثہ میں ملا ہے۔ ان کے والد حکیم محمد احمد صاحب خود صاحبِ تصانیف تھے اور دادا مولانا برکات احمد صاحب کا تو ذکر ہی کیا کیجیے۔ وہ تو علم کا دریا تھے۔ مخلوقِ خدا ان سے سیراب ہوتی۔ محمود میاں خاموشی سے علمی کام کرتے رہتے ہیں۔ اس سے ان کی غرض نہ حصول عہدہ و منصب ہے، نہ جلب منفعت، نہ شہرت و ناموری۔ وہ علمی کام خالصتاً علمی اغراض سے کرتے ہیں۔ علم کا یہ مفہوم بھی اب مفقود ہوتا جاتا ہے۔ علم کے لیے علمی ضرورت اب ایک انتہائی غیر اہم محرک بن گئی ہے۔ پھر بھی کچھ دِوانے علم کو برائے علم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ محمود میاں انھی لوگوں میں سے ہیں۔ وہ مسلسل مطالعہ کرتے جاتے ہیں اور متعلقہ مواد میں شامل کرتے جاتے ہیں۔ اس طرح بیک وقت کئی موضوعات پر مواد آہستہ آہستہ جمع ہوتا رہتا ہے۔ درجنوں موضوعات پر اس طرح مواد ان کے پاس موجود رہتا ہے اور جس موضوع پر کام کرنا چاہیں بہ آسانی کر سکتے ہیں۔

میں نے علما کو عموماً علمی تعاون میں بخیل پایا۔ اس معاملے میں کسی قدر احتیاط تو بہرحال لازم ہے کہ اکثر کام کرنے والے مواد کا استعمال یا تو غلط کرتے ہیں یا سرے سے مواد ہی ضائع کر دیتے ہیں لیکن محمود میاں اس معاملے میں بھی بڑے فیاض ہیں۔ کوئی شخص ذکر کر دے کہ وہ فلاں موضوع پر کام کرنا چاہتا ہے۔ یہ مصادر و ماخذ کی نشان دہی شروع کر دیں گے۔ جو ماخذ ان کے پاس ہوں گے وہ بلا تکلف پیش کر دیں گے۔ بعض اوقات تو اپنے کیے ہوئے کام عنایت کر دیتے ہیں کہ اب اس کام کو آگے بڑھالو۔ اتنی فیاضی اور ایسی دریا دلی کم ہی علما میں پائی۔

محمود میاں کی نظر بڑی کافر ہے۔ مروت کی اور بات ہے ورنہ وہ انسانوں کا مطالعہ بڑی ژرف نگاہی سے کرتے ہیں۔ اپنے احباب، اعزاز و اقارب، ملنے جلنے والوں اور دوست آشناؤں کی کم زوریوں اور خامیوں سے وہ پوری طرح واقف رہتے ہیں۔ بعض کم زوریوں کو بادلِ نخواستہ اور بعض کو اپنی فطری مروت کی وجہ سے برداشت کرتے رہتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس سے ناواقف ہیں۔ ان کے حلقۂ احباب میں، میں ایک سے زیادہ ایسے افراد سے واقف ہوں جو کتاب چور ہیں۔ بعض حضرات تو اس میدان کے ڈاکو ہوتے ہیں۔ محمود میاں چڑ کے پر چڑ کے کھاتے جاتے ہیں مگر ان کو کتاب دینے سے باز نہیں آتے۔ کبھی کبھی بڑی پست آواز میں اس حرکت پر ہلکا سا احتجاج بھی کر لیتے ہیں مگر انھیں انسانوں کو ان کی کم زوریوں کے ساتھ نبھانا خوب آتا ہے۔ کسی شخص کی دو خامیاں بیان کریں گے تو دوسرے موقع پر اس کی چار خوبیاں بیان کر کے حساب برابر کر دیتے ہیں۔ پھر بھی وہ نمود و نمائش کرنے والوں اور منافقوں کو برداشت نہیں کر پاتے۔ اس طرح کے لوگ انھیں طبعاً پسند نہیں اور شاید ان کے ساتھ وہ بہت زیادہ نباہ نہیں کر سکتے۔

انھیں اپنے بچوں کی تربیت کا بڑا خیال رہتا ہے۔ ان پر وہ بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ سخت گیر نہیں ہیں۔ ایک خاص حد تک انھوں نے بچوں کو آزاد چھوڑ رکھا ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے وہ کسی بچے کو کوئی خاص نقطۂ نظر یا طریق کار اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرتے لیکن اس کے باوجود ان کی اپنی کچھ پسند اور ناپسند ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کی اگلی نسلیں انھیں خطوط پر آگے بڑھیں، جو انھیں عزیز ہیں۔ جبر و اختیار کے درمیان خط امتیاز یہاں بھی بہت باریک ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ صرف دائرہ کی خارجی لکیر سے دل چسپی رکھتے ہیں، دائرے کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے بس وہی آزادی ہے۔ دائرے کے خطوط کی حدود کو توڑنا انھیں پسند نہیں مگر وہ چاہتے ہیں کہ یہ ساری کارروائی رضا کارانہ ہو۔ وہ فیضانِ نظر کے قائل ہیں اور اس سے کام چلانا چاہتے ہیں، اس لیے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے زیادہ سے زیادہ ان سے قریب رہیں تا کہ ان کے اسلوب و

انداز اور طرز حیات کو دیکھیں، پرکھیں اور احتیاط کریں۔ کبھی کبھی وہ اپنے رویّے کے مصالح کی وضاحت بھی کر دیتے ہیں اور کبھی بچوں کے رویّے پر گرفت بھی کرتے ہیں۔ ان کے تمام بچّے بحمدہ ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کے مطابق ہی ہیں مگر کوئی بھی بچّہ اپنے باپ کی ہُو بہُو نقل نہیں ہوتا، نہ ہوسکتا ہے لیکن وہ فرضی ''خلائے نسلی''، جس کا ذکر آج کل بہت زیادہ اور غیر ضروری حد تک کیا جارہا ہے محمود میاں کے ہاں مفقود ہے۔ اس سے یہ بھی تو ثابت ہوتا ہے کہ یہ خلا والدین کی اولاد سے غفلت کا نام ہے اور کچھ نہیں۔

یہ نایاب انسان ناقدریٔ قوم کی سیاہ کاریوں کی نظر ہوگیا۔ 9 جنوری 2013ء ایک دہشت گرد نے مطب میں گھس کر فائرنگ کی اور انھیں شہید کر دیا۔ حکومت اس قابل کہاں تھی کہ معلوم ہوتا کہ قاتل کون تھا۔